افتخار عارف کی مزاحمتی شاعری

ڈاکٹر زینت افشاں[1]

Abstract:

"Iftikhar Arif is a significant Poet of Urdu Ghazal and Nazm (Poem). He set new trends and made considerable addition to the poetic tradition of Urdu. He took forward the artistic traditions of Urdu poetry through his versatile creativity. He is a prominent and well known progressive intellectual poet. He is adherent to the deprived people. This research article discusses the Iftikhar Arif's struggle through his pen. In this article researcher places Iftikhar Arif's Poetry within the ambit and larger framework of resistance literature and bracketed him with Urdu's intellectual resistance tradition. The writer places Iftikhar Arif in the golden literary tradition of resistance."

دنیا میں ہمیشہ شاعروں اوردانش وروں کے ہاں حسن، خیر، عدل، مساوات اورنیکی کی تبلیغ و ترویج کو ترجیح اوّل حاصل رہی ہے۔ شاعر اورادیب کسی بھی مذہب، زمانے، ملک، قوم، نظریےاورخیال کا ہو، ہمیشہ انسان کی عظمت، شرف اور بھلائی کی بات کرتا رہا ہے۔ یہ ایسا کلیہ ہے جو معلوم تاریخ سے آج تک ہر لکھنے والے اور اہلِ دانش کو پرکھنے کے لیے کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔عظیم او ربڑے شعروں کی کوئی سی بھی فہرست بنائیں تو شاعروں اور دانش وروں کا کل اثاثہ سب انسانوں کے لیےبہتر زندگی کے لیےمسلسل جدوجہدکی روایت میں گندھا ہوا ہوتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں سوویت انقلاب کے بعد عالمی ادب میں ترقی پسند ادب کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ ماسکو، لندن، پیرس، لکھنو اور لاہور سمیت بہت سے شہر ایسے لکھنے والوں کے ناموں سے پہچانے گئے جن کا تعلق ترقی پسند ادب کے نظریے سے تھا۔ بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک عوام کے محنت کش، پس ماندہ اور غریب طبقات کی بہتری کے لیے ادب اور تخلیق کے ہتھیار، ذریعے اور وسیلے کے طور پر استعمال کرتی رہی۔گورکی ہوں یا سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری ہوں یا لاطینی امریکہ کے نیرودا،ترکی کے ناظم حکمت ہوں یا فارسی کے احمد شاملو، فرانس کے سینگھور ہوں یا ویتنام کے ہوچی من یا بنگال کے نذ ر الاسلام، یہ سب مختلف زبانوں میں ادب تخلیق کرتے رہے مگر اپنے اپنے اسالیب و بیان کے منفرد قرینوں اور سلیقوں کے باوجود ان کا ہدف ایک عادلانہ نظام معاشرت و معیشت قائم کرنا تھا۔ انسان کی سربلندی اور فضیلت کا یہ خوبصورت خواب جدوجہد کا متقاضی تھا چناں چہ فیض احمد فیض نے واضح طور پر اپنے نظریہ جہاں بینی اور تصور شعر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ادیب کوانسان کی بہتری کے لیے اپنے فن کے ساتھ وابستگی کے ساتھ ساتھ اس کی فلاح کی عملی جدوجہد میں بھی صاحبان علم وادب کو شریک ہونا چاہیے۔ یہی وہ نظریہ تھا جس نے بین الاقوامی طور پر سرمایہ دارانہ نظام اور دوسرے استحصالی نظاموں کے خلاف قلمی جدوجہد کا آغاز کیا۔اردو کے صاحبِ اسلوب شاعر اور عظیم دانش ورفیض احمد فیض کہتے ہیں:

> "رہا کلچر کی وسعت کا سوال تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ سماج جس میں دولت اور ذرائع پیداوار کسی محدود طبقے کے ہاتھ میں ہوں، زندگی کی باقی آسائشوں کی طرح، اپنا مروجہ کلچر بھی اسی ایک طبقے کے حوالے کر دیتی ہے اور باقی ماندہ طبقوں کو اس کلچر میں ذرا بھی حصہ نہیں ملتا۔ مثلاً جب ہم یونانی کلچر، ایرانی کلچر یا کسی اور قوم کے کلچر کا نام لیتے ہیں تو دراصل ہماری مراد اس قوم کے ایک نہایت ہی محدود خوشحال طبقے کے کلچر سے ہوتی ہے لیکن کیا ہم کسی ایسی قوم کو مہذب یا کلچر یافتہ کہہ سکتے ہیں جس کی اکثریت کلچر سے محروم ہو؟ کیا ہم ایسے کلچر کو مثالی قرار دے سکتے ہیں۔ جو سماج کی اکثریت میں نفوذ نہ

---

[1]اسسٹنٹ پروفیسر،یونیورسٹی آف ایجوکیشن،فیصل آباد کیمپس

کر سکے؟ کلچر کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایک خوبصورت حاشیے کا کام دینے کی بجائے سماج کی تار تار میں بنا جاسکے۔ چنانچہ کلچر کی ترقی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسے اقلیت کے چنگل سے نکال کر اکثریت کی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس کے لیے ایک دوہرے عمل کی ضرورت ہے:

کلچر کی نوعیت بدلی جائے تاکہ عوام کی زندگی کا جزو بن سکے۔

عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اس کلچر کو قبول کر سکیں۔

اب تک جو کچھ کہا جاچکا ہے اس کا خلاصہ یوں ہو سکتا ہے:

الف۔ترقی پسند ادب وہ ہے جو کلچر کی ترقی میں مدد دے۔ کلچر کی ترقی کا یہ مطلب ہے کہ:

سماجی اقدار کی ترتیب موزوں کی جائے اور صحیح اقدار کا پرچار کیا جائے۔

ان اقدار کو عوام کے لیے اجتماعی طور پر سہل الحصول بنایا جائے۔

ب۔یہ دونوں باتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سماجی نظام کی بنیادی طور پر اصلاح نہ کی جائے۔ پس ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے،(ان مسائل میں غالباً طبقاتی کشمکش اور دنیوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہیں) اور سماج میں ایسے فکری، جذباتی یا عملی رجحانات پیدا کرنا ہے جن سے ان مسائل کا حل نسبتاً آسان ہو جائے۔"(1)

یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا میں کسی دوسری ادبی تحریک نے اتنے بلند قامت اہل قلم متعارف نہیں کرائے جتنے ترقی پسند تحریک کے حصے میں آتے ہیں۔ غیرمنقسم جنوبی ایشیا میں صرف اردو زبان و ادب پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ سجاد ظہیر،علی سردار جعفری، اسر ار الحق مجاز،مخدوم محی الدین، معین احسن جذبی، جانثار اختر، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس اور ادھر پاکستان میں فیض احمد فیض، شیخ ایاز، اجمل خٹک، گل خاں نصیر، ظہیر کاشمیری، احمد ندیم قاسمی، سید سبط حسن، منیرنیازی، ممتاز حسین، حبیب جالب، ظہیر کاشمیری، احمد فراز، عطا شاد، خالد علیگ، حسن عابدی، ادا جعفری، کشور ناہید،نور الہدی شاہ، تنویر عباسی، جانباز جتوئی، فہمیدہ ریاض اور زہرا نگاہ سمیت اہل علم کی ایک کہکشاں ہے جو افق ادب پر گذشتہ چند عشروں سے روشنی بکھیر رہی ہے۔اسی قبیلے میں ایک نام افتخار عارف کا ہے۔ ان کے شاعرانہ قدو قامت اور مرتبے کی تشکیل میں جو بنیادی عناصر کارفرما ہیں ان پر گفتگو بعد میں ہو گی مگر ابتداً پیش گفتار کے طور پر عرض ہے کہ عالمی واقعات کے تناظر اور بالخصوص پاکستان کی بدلتی صورت حال پر ادب کی طرف سے جو بیانیہ مرتب ہو گا، اس کی ایک معتبر گواہی افتخار عارف کی طرف سے دی جا سکے گی۔ اب یہ بات موضوع گفتگو نہیں رہی اور جہان دانش کے تمام لوگ اسی نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ کسی بھی زمانے کی تاریخ جاننے کے لیے صرف اس زمانے کی سرکاری دستاویزات یا سیاست اور حالات حاضرہ پر لکھی گئی کتابیں اور آثار اپنی جگہ بے حد اہم سہی مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سب سے زیادہ معتبر گواہی اہل قلم فراہم کرتے ہیں۔ افتخار عارف کہتے ہیں:

"لفظ میرے نزدیک خالق کائنات کی ایک عظیم نعمت بھی ہے اور خلق خدا کی امانت بھی۔ دنیا میں نفاذ خیر و عدل کیلئے اور فروغ حسن و خوبی کے لیے اور احترام و اعتراف عظمت انسانی کے حوالے کے طور پر اور ترویج اقدار آدمیت کی غرض سے لفظ تاریخ آدم و عالم میں ہمیشہ ممتاز و محترم حیثیت کا حامل رہا ہے۔ حقوق انسان کی سربلندی و سرفرازی کی خاطر اور آزادی، امن اور حق کے ثبات و قیام کی جدوجہد میں لفظ کاانتخاب ہمیشہ صاحبان علم و ہنر اور اہل دانش و بینش میں وجہ افتخار و تکریم گردانا جاتا رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آزمائش کے ہر مرحلے پر، مہارت کے ہر محاذ پر، ابتلا کی ہر منزل پر ہمارے اہل قلم نے اپنے فریضے کی ادائیگی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔"(2)

بلاشبہ 1947ء سے لے کر آج تک سیاست کی جودگر گوں اور لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال اور قومی سطح پر جو اہم واقعات رونما ہوتے رہے ہیں ان سب پر تمام لکھاریوں نے بساط بھر تخلیقات فراہم کیں۔تاریخ پاکستان کے سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور جمہور کے خلاف اقدامات

کے حوالے سے کوئی سا واقعہ بھی لے لیجیے، اہل قلم اور اہل دانش و بینش نے ہر موقعے اور واقعے پر اپنے ردّعمل کی صورت میں سچی گواہی دینے سے گریز نہیں کیا۔

افتخار عارف 21-مارچ 1943ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ فرنگی محل، گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلم حاصل کی۔لکھنؤ یونیورسٹی نے حال ہی میں اپنی ویب سائٹ پر ایسے دس طلبہ و طالبات کی فہرست جاری کی جو زندگی کے مختلف میدانوں میں ممتاز ہوئے۔ اس فہرست میں سجاد ظہیر، عطیہ حسین اور قرۃ العین حیدر کے ساتھ افتخار عارف کا نام شامل ہے۔ 1965ء میں ریڈیو پاکستان سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ریڈیو پر خبریں پڑھیں اور بعد میں پی ٹی وی سے منسلک ہو گئے۔ عبید اللہ بیگ اور قریش پور کے ساتھ شہرہ آفاق معلوماتی پروگرام کسوٹی کرتے رہے،جس نے پوری اردو اور نشریاتی دنیا میں دھوم مچادی۔ 1977ء میں عالمی شہرت یافتہ ادارے بی سی سی آئی کے بانی آغا حسن عابدی، افتخار عارف کو برطانیہ لے گئے اور "اردو مرکز" جیسے ممتاز ادبی اور تہذیبی ادارے کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ 1990ء میں پلٹ کر پاکستان آئے تو اکادمی ادبیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، نیشنل بک فاؤنڈیشن اور رائٹرز اینڈ سکالرز فاؤنڈیشن کے سربراہ مقرر ہوئے۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز میں بھی کچھ عرصہ تدریسی خدمات انجام دیں۔

2011ء میں ای سی او ممالک کی تنظیم کے ادارے ای سی او آئی سی کے صدر مقرر ہو کر تہران گئے۔ ساڑھے تین سال اس ادارے میں پاکستان کی سفارتی نمائندگی کرتے ہوئے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

افتخار عارف کا شعری سفر پچپن برسوں کو محیط ہے۔ مہردونیم، حرف باریاب، جہان معلوم، کتاب دل و دنیا اور شہر علم کے دروازے پر کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی، روسی اور ہندی میں ان کی منتخب شاعری کے تراجم دوسرے ملکوں میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔

ان کے شعری مجموعوں کو ملنے والے اعزازات میں رائٹرگلڈ کا آدم جی ایوارڈ، نقوش ایوارڈ، اکادمی ادبیات پاکستان کا علامہ اقبال ایوارڈ اور حال ہی میں دیا گیاکراچی آرٹس کونسل کا لائف ایچیومنٹ ایوارڈ سمیت متعدد دوسرے ایوارڈز بھی شامل ہیں۔ ان کی غیر معمولی اور شاندار ادبی اور انتظامی خدمات کے پیش نظر حکومت پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس، ستارہ امتیاز اور ہلال امتیاز جیسے گراں قدر اعزازات سے نوازا۔

افتخار عارف ایک ممتاز اور نام ور شاعر اور دانش ور کی حیثیت سے یورپ و امریکہ سمیت درجنوں ممالک میں منعقدہ کانفرنسوں، مذاکروں، سیمی ناروں اور مشاعرونمیں پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

لندن میں قیام کے دوران افتخار عارف دنیا بھر میں اردو کے بے پناہ مقبول اور صاحب اسلوب شاعر کی حیثیت سے شناخت کیے جانے لگے۔ عالمی سطح کے مشاعروں میں غیر معمولی داد سمیٹی اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچے۔ گو پاکستان سے برطانیہ جاتے وقت وہ پاکستان کے شہروں اور دیہات میں اپنی شہرت کا لوہا منوا چکے تھے مگر برطانیہ میں قیام کے دوران میں عالمی سطح پر پذیرائی کا گراف اپنے عروج کو چھو رہا تھا۔فیض صاحب نے افتخار عارف کے پہلے شعری مجموعے "مہر دونیم" کے پیش لفظ میں ایک انتہائی اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے:

> "پھر جدید مضامین و مطالب کی ادائیگی میں روایت کے خزینے سے یوں کسب فیض کیا ہے کہ تلمیح کو علامت اور علامت کو استعارے کا روپ دے کر نظم اور غزل دونوں کے لیے رمز و کنایہ کا نیا سامان پیدا کیا ہے۔ اس ضمن میں اب سے پہلے عشق و طلب، ایثار و جاں فروشی، جبر و تعدی کا بیان صرف منصور و قیس اور فرہاد وجم کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ پھر جب گھر میں دارورسن کی بات چلی تو مسیح و صلیب کے حوالے بھی آگئے لیکن المیہ کربلا اور اس کے محترم کرداروں کا ذکر بیشتر سلام اور مرثیے تک محدود رہا۔ صرف علامہ اقبال کی نگہ وہاں تک پہنچی............افتخار عارف نے گزارش احوال واقعی کے لیےاس ماخذ سے بہت اثر آفریں اور خیال افروز کام لیا...........گزارش احوال واقعی کے سلسلے

میں ظلم و تعدی، جبروزباں بندی کی شرح کی ہے............دوسرا مضمون تنہا فرد کی بے کسی اور بے بسی کا بھی ہے اور حریف سے نبرد آزما ہونے کی طلب اور تمنا کا بھی...........تیسرا مضمون رزق کی مصلحت کے اسیروں کی محتاجی اور تن آسانی کا بھی ہے اور اس تذلیل سے سرکشی کا بھی...........اور آخر میں بظاہر غیر مختتم انتظار نجات۔"(3)

مندرجہ بالا آرا کا حوالہ اس لیے ضروری تھا کہ بجا طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ جو لوگ مذہبی یاروحانی یا عقیدے کا ادب تخلیق کرتے ہیں ان کو دائیں بازو کے خانے میں ڈال دیا جاتا ہے اور جو لوگ انکار و انقلاب کی باتیں کرتے ہیں انہیں بائیں بازو کا نقیب سمجھا جاتا ہے۔

لاطینی امریکہ میں فوجی آمروں کے خلاف عوامی تحریکوں میں نیا نظریہ وضع کیا گیا جسے Radical Theology یعنی مذہب کے اندر پنہاں، حرت و فضیلت انساں کے عناصر کی بنیاد پر جدوجہد کرنا اور برابری اور بہتر زندگی کے لیے ایک عادلانہ نظام قائم کرنا اس کا مقصد تھا۔ افتخار عارف نے کم وبیش اسی نظریے کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا مگر انہوں نے بقول فیض، اقبال کی شعری روایت سے استفادہ کیا۔ اقبال واضح طور پر امت مسلمہ کے لیے جو مثالیے تلاش کرتے ہیں ان میں کربلا کا استعارہ اور سبط رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بے مثال قربانی کا حوالہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال کا شعر ملاحظہ کیجیے:

"غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ"(4)

اقبال نے بتایا کہ اگر امت فلاح چاہتی ہے، سربلندی چاہتی ہے اور زندگی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے تو اس کوحضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جیسی شخصیات کی تقلید لازم آتی ہے۔ شاعری کے آغاز سے لے کر آخر تک جگہ جگہ اقبال نے خاندان رسالت کے مثالیوں سے اپنی عقیدت کا اظہارکیا ہے۔ ارمغان حجاز، اقبال کی آخری کتاب ہے، اس کے آخری چار مصرعے دیکھیے:

"قلندر میل تقریرے ندارد
بجز ایں نکتہ اکسیرے ندارد
از ان کشت خدابے حاصلے نیست
کہ آب از خون شبیرے ندارد"(5)

اور یہ بھی کہا:

"اہل حق حریت آموز از حسین
رمز قرآں از حسین آموختیم"(6)

یہی وہ روایت تھی جس کومرثیہ گوئی میں مثالیے کی حیثیت رکھنے والے میر انیس اورمیرزا دبیر کے شہر مرثیہ سے آنے والے افتخار عارف نے اپنے لیے لائق تقلید جانا اور اپنے اشعار میں بے حد عمدہ اور باوقار طریقے سے برتا۔واقعہ کربلا کے حوالے سے افتخار عارف کے ہاں لفظ، تراکیب، تشبیہات، استعارے اور تلازمات بے حد عمدہ اور خوب صورت انداز میں نمود کرتے ہیں، اردو کے نام ور محقق، تنقید نگار اور دانش ور گوپی چند نارنگ نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

" افتخار عارف کے یہاں بنیادی تاریخی حوالےسے فیضان حاصل کرنے اور اس سے گونا گوں شعری کیفیات ابھارنے کا ان کا شعری پیرایہ شدید انفرادیت رکھتا ہے۔ پیاس، دشت، گھرانہ، رن پڑنا، ایک کتاب اور ایک امید،اثاثہ، ڈھالیں، شام، مسافر، چاک گریباں، قافلہ بے سروساماں، شام غریباں، قاتل، خنجر، خیمہ، لشکر، نوک سناں، سپاہ شام، نیزے پہ آفتاب کا سر، یہ سب سامنے کے تعلیقے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت محض الفاظ کی نہیں، یہ وقت کی محض ایک سطح پر کسی ایک حقیقت کو ظاہر نہیں کرتے، بلکہ افتخار عارف کا شعری وجدان موجود صورت حال کی سفاکی کے بیان میں ان سے نئی نئی معنیاتی جہات پیدا کرتا ہے۔ غور فرمائیے کہ وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانا ہے، میں جہاں ضمیر" وہی" کی تکرار اور "ہے" حالیہ صیغہ نے جو ردیف کا حصہ ہے، ان اشعار کو لمحۂ موجود سے جوڑ دیا ہے، وہاں پیاس، دشت، گھرانا، مشکیزہ، وغیرہ علائم اس سانحۂ عظیم کی یاد تازہ کرتے ہیں، جس نے حق و

صداقت کے تحفّظ کی خاطر خون کی گواہی سے انسانیت کو صدیوں سے سیراب کررکھا ہے۔"(7)

افتخار عارف نہایت استقامت سے اپنے وراثتی عقائد پر قائم ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کا اسلامی تشخص برقرار رکھتے ہوئے ادبی وتہذیبی سرمایہ کے ساتھ ماضی کے زندہ کرداروں سے بھر پور فائدہ اٹھایا ہے۔ 'کربلا' کا استعارہ تمام بڑے اور چھوٹے شعرا نے اپنے اپنے ذوق سلیم کے مطابق اپنی شاعری میں اپنایا ہےلیکن افتخار عارف ان سب میں اپنا منفرد اور نمایاں مقام حاصل کرنے میں اس لیے کامیاب رہے کہ ان کی پرورش لکھنؤ کے جس تہذیبی ماحول میں ہوئی اس میں انہوں نے 'کربلا' کے استعارے سے براہ راست استعفادہ کیا۔

اس تہذیبی و ادبی سرمایہ سے واقفیت کی بنا پر افتخار عارف کے ہاں'کربلا' صرف مخصوص رجحان کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ اس میں بہت ہمہ گیری اور کشادگی ہے، جو ان کی وسعت نظری کا ثبوت ہے۔ افتخار عارف کے فکر ونظر میں کربلا کا واقعہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ زندگی کا ایک رویہ ہے۔ اس لیے وہ 'کربلا' کو ایک گزرے ہوئے ماضی کی طرح نہیں بلکہ ایک زندہ رویے کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ ظلم کے خلاف ایک ایسی پیکار جو 'کربلا' میں ہوئی وہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی۔ان کے یہ اشعار قابل غور ہیں:

"یہی نہیں کہ صرف اپنے عہد میں ہو آج بھی
جہاں مصلحت میں حرف برملا ہے کربلا
ہر ایک جبر کے خلاف خیر کے محاذ پر
جو مستقل بپا رہے وہ معرکہ ہے کربلا"(8)

کربلا افتخار عارف کی روحانی سر زمین ہےاس لیے ان کی روح اسی میدان اور مٹّی میں سرگرداں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں بار بار کربلائی استعاروں کی طرف لوٹتے ہیں۔ 'المیۂ کربلا' اسلامی تاریخ کا ایک ایسا ناقابل فراموش واقعہ ہے جس میں رسول اللہ کے خاندان کے افراد کے علاوہ دیگر محترم افراد بھی شامل تھے۔ انہوں نے یہ معرکہ انہوں نے نام ونسب سے نہیں بلکہ قوت ایمانی سے جیتا۔

اردو شاعری میں کردار نگاری کی روایت بہت پرانی ہے۔ شاعری میں ہمیشہ ہی سے یوسف، فرہاد، قیس، محبوبہ وغیرہ کے کرداروں کی تصویرکشی کی جاتی رہی ہے۔ افتخار عارف کی انفرادیت خاص یہ ہے کہ انہوں نے جن شخصیات کا انتخاب کیا۔ وہ تمام تر نامور اسلامی کردار ہیں، جو ان کی شاعرانہ فکر میں محبوب فکری کرداروں کے طور پر سامنے آئے ہیں۔

افتخار عارف نے باقاعدہ مذہبی حوالوں کے ساتھ ان کردراوں کو پیش کیا ہے وہ ایسے کردار ہیں، جو ہر سچے مسلمان کے لیے مشعل راہ اور ان کے دلوں میں آباد ہیں۔ وہ جرات وہمت، صبر واستقامت او رشجاعت کا پیکر تھے۔ افتخار عارف کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بات مکمل ادراک کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ماضی کے کرداروں کے ذریعے آج کے مسلمانوں کو جھنجوڑنے کی کوشش میں ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اسلامی کرداروں سے درس زندگی لیا ہے۔درج ذیل اشعار دیکھیں:

"کیسا لگتا ہوں جب کرتا ہوں مدح اہلِ بیت
کیسا لگتا ہے میرے سر پر عَلم عباس کا
ہم غلامانِ درِمشکل کشا، مشکل کے وقت
چومتے ہیں یا علی کہہ کر علم عباس کا"(9)

تاہم شاعر روحانی طور پر بیدار مسلمانوں کا خواہاں ہے۔ اس لیے اس نے جن اسلامی شخصیات کا ذکر نہایت عزت و احترام سے کیا ہے ان میں ابو ذر غفاری، اسامہ بن زید، حضرت زینب، حضرت فاطمہ ، حضرت عباس، حضرت علی، امام حسن اور امام حسین شامل ہیں۔افتخار عارف نے اپنی ایک نظم "ابو طالب کے بیٹے" میں لکھا ہے کہ:

"وہ مسلم ہوں کہ وہ عباس ہوں عون و محمد ہوں علی اکبر ہوں قاسم ہوں علی اصغر ہوں
حق پہچانتے تھے
لشکرِباطل کو کب گردانتے تھے

ابو طالب کے بیٹے سربریدہ ہو کے بھی اعلان حق کرتے رہے ہیں
ابو طالب کے بیٹے پابجولاں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں
ابو طالب کے بیٹے صرفِ زنداں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں"(10)

مدینہ، نجف، کربلا، کاظمین و سامرہ ہوں کہ مشہدو بغداد ہر جگہ ابوطالب کے بیٹوں کے قدموں کے نشان موجود ہیں اور انسانیت ان سے تاابد فیض یاب ہوتی رہے گی۔ افتخار عارف اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ:

"ابو طالب کے بیٹوں اور غلامانِ علی ابنِ طالب میں اک نسبت رہی ہے
محبت کی یہ نسبت عمر بھر قائم رہے گی
تا ابد قائم رہے گی"(11)

وہ ظالموں کو ان کے انجام سے آکاہ کرتے ہیں کہ ظلم و بربریت کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس کے لیے انہوں نے مؤثر انداز اپنایا ہے، ملاحظہ کیجیے دو شعر:

"ذکرِ مظلوم کو انعام میں رکھا گیا ہے
ظلم کو زمرۂ دشنام میں رکھا گیا ہے
از ازل تا بہ ابد سارے یزیدوں کا حساب
ایک ہی دفترِ بدنام میں رکھا گیا ہے"(12)

افتخار عارف حضرت امام حسین کے شکر گزار اور احسان مند ہیں کہ ان کی وجہ سے اسلام قیامت تک کے لیے زندہ ہو گیا اور مظلوم نڈروبے خوف، کیونکہ انہوں نے خود ظالموں سے ڈٹ کر مقابلہ کر کے ہمت و شجاعت کی مثال قائم کر دی۔ دیکھیے افتخار عارف کا یہ شعر:

"حسین تم نہیں رہے تمہارا گھر نہیں رہا
مگر تمہارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا"(13)

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ عالم اسلام کی ایک بہت بڑی شخصیت ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ان کے بارے میں تعریف کے متعدد کلمات کہے ہیں جو حدیث شریف کی کتابوں میں موجود ہیں۔حضرت ابو ذر غفاری وہ شخصیت ہیں کہ جنہوں نے اسلام میں اہل ثروت و دولت کے حوالے سے ایسا موقف اختیار کیا جو ان کے زمانے میں ناقابل قبول تھا اور اس وقت کی زندگی میں اس کو نافذ کرنا محل نظر سمجھا گیا۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پر مقدمہ چلا اور انہیں ربذہ کے دور افتادہ مقام پر جلا وطن کیا گیا۔ یہ سارا واقعہ تاریخ کی کتابوں میں مکمل تفصیلات کے ساتھ موجود ہے۔اور یہ ایک تلخ حقیقت بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے کہ وہیں ان کا انتقال ہوا۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں اور بالخصوص ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف تحریک میں اسلام پسند حلقے یکجا ہو گئے تھے۔ نظام مصطفی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے عنوان سے تحریک چلائی گئی جو جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا پر منتج ہوئی۔ اپنے مفاد کے لیے مذہب کو استعمال کرنے کا رویہ ایک سطح پر محل نظر تھا۔ چناں چہ افتخار عارف نے اس کے خلاف آواز آٹھائی اور اس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں کوئی لفظ ایسا نہیں تھا جس پر گرفت کی جا سکتی ہو مگر حسن یہ تھا کہ سب کچھ برملا کہہ دیا گیا تھا۔ یہی نہیں، پوری اسلامی تاریخ پر ایک نظر ڈالی گئی تھی، جس میں عظیم لوگوں کو مذہب کی آڑ لے کر ہدف ملامت بنایا گیا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ، دعوت وعزیمت کے راستے پر جانے والے صاحبان فکر و عمل سے بھری پڑی ہے۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی کی کتاب" تاریخ دعوت و عزیمت" پر نظر ڈالیں تو پوری فہرست سامنے آ جاتی ہے۔ ابو ذر غفاری پر اردو میں بھی بہت مواد موجود ہے مگر خاص طور پر دو کتابیں مناظر احسن گیلانی مرحوم اور ایران کے مشہور اسکالر ڈاکٹرعلی شریعتی کی کتاب "غریب ربذہ: ابو ذر غفاری" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔علی شریعتی نے حضرت حجر ابن عدی پر بھی اسی سلسلہ عزیمت کی ترویج واشاعت کےضمن میں کتاب لکھی ہے۔ ہمارے اس عہد کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ دمشق میں ان کی قبر کو اکھاڑ دیا گیا۔ ان کی ذات گرامی کے بارے میں اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول سند سمجھا جاتا ہے، جس میں ان کے زہد و فقاہت کا ذکر کیا گیاہے۔

افتخار عارف کاکمال اور امتیاز یہ ہے کہ وہ عالمی تاریخ سے بالعموم اور تاریخ اسلامی اور عظیم ہستیوں کے احوال و سیرت سے کامل آگاہی رکھتے ہیں۔ دیکھیے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھی گئی نظم میں کیا خوب صورت اسلوب اختیار کیا گیا ہے:

"ابو ذر غفاری کے لیے ایک نظم''

سلام ان پر، درود ان پر
وہ کہہ رہے تھے
زمیں نے بوجھ ایسے آدمی کا نہیں اٹھایا، جو تم سے سچا ہو اے ابو ذر
وہ کہہ رہے تھے
فلک نے سایہ نہیں کیا، ایسے آدمی پر، جو تم سے سچا ہو، اے ابو ذر
سبھی یسارو یمین تصدیق کر رہے تھے
تمام اہل یقین تصدیق کر رہے تھے
سلام ان پر، درود ان پر
مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا
وہی مدینہ ہے اور ابو ذر ہیں اور منبر ہے اور منبر کا فیصلہ ہے
اور اب جو منبر کا فیصلہ ہے، وہ قول صادق سے مختلف ہے
جو قول صادق سے مختلف ہے، وہ فیصلہ میرے اور منبر کے درمیان
اک سوال بن کر ٹھہر گیا ہے
بہت زمانہ گزر گیا ہے مگر ابو ذر نگاہ میں ہیں
پس کمیں گاہ جبر زور آوروں کی سازش کے سامنے منظر
نگاہ میں ہیں
دمشق و بغداد و قرطبہ کے سلاسل مصلحت کی بخشش
پہ پلنے والے تمام منبر نگاہ میں ہیں
جہان مظلوم خواب دیگر کا منتظر ہے
نیا زمانہ نئے ابوذر کا منتظر ہے"(14)

ایسے ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اپنے آخری وقت میں آزاد کردہ غلام حضرت سیدنا زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید کے نوجوان بیٹے سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک لشکر کے ساتھ کافروں کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے روانہ کیا۔ اسی اثنا میں آقا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بیماری میں شدت کی خبر عام ہو گئی۔ جیش اسامہ میں شریک بعض صحابہ کرام نے اپنے قبائلی تصور تفوق کی بنیاد پراسلامی لشکر کو ایک غلام کی قیادت میں جہاد کے لیے بھیجنے پر تحفظات کا اظہار کیا۔ بعد میں سرکار دوعالم کے پردہ فرما جانے کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حکماً اس لشکر کو اسامہ بن زیدرضی اللہ عنہ کی قیادت میں روانہ کیا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ تفاخر کے اس طبقاتی تصور کے خلاف افتخار عارف کی یہ نظم اردو شاعری میں پہلی دفعہ دیکھنے میں آتی ہے،ملاحظہ کیجیے:

اسامہ ابن زید کے نام ایک نظم

پرچم جیش اسامہ مرا اعزاز کہ میں
تیرے ناموس کو کرتا ہوں سلام
اک طرف سارے نجیب ابن نجیب ابن نجیب
اک طرف ایک غلام ابن غلام ابن غلام
حرمت حرف رسول ایک طرف
جادہ نخوت پارینہ کی اڑتی ہوئی دھول ایک طرف
اب بھی نخوت ہے وہی جبّہ و دستار کے بیچ
وہی معیار شرف درہم و دینار کے بیچ
اک غلام ابن غلام ابن غلام
اب بھی نرغے میں ہے اک شہر دل آزار کے بیچ

نرغہ اہل تکبر سے نکالے مجھ کو
کوئی صدیقؓ نہیں ہے کہ بچالے مجھ کو"(15)

شاعری میں حضرت ابو ذرغفاری کا حوالہ، اقبال کے علاوہ جدید اردو شاعری میں دور دور تک کہیں نہیں ملتا۔ حضرت حجر ابن عدی کے حوالے سے بھی پوری مشرقی شعری روایت میں کہیں کچھ نظر نہیں آتا۔یہ تینوں اصحاب وہ ہیں جو حضورنبی اکرمؐ کے عہد میں محترم ٹھہرائے گئے مگر بعد میں آنے والوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا،کیوں کہ وہ انہیں اپنے مفادات کے خلاف سمجھ رہے تھے۔ افتخار عارف نے اپنی نظم "سلام حجر بن عدیؓ" میں جہاں ممدوح کو عقیدت کے پھول پیش کیے، وہیں عہد حاضر میں عالم اسلام کی حالت زار کا پردہ کیسے چاک کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

" سلام حجر بن عدیؓ
سلام حجر بن عدیؓ
سلام حجر بن عدیؓ
ستم گری کی حد ہوئی
مزار منہدم ہوا
جو مرجع عوام تھا
وہ جس کا صاحبان حق نگر میں احترام تھا
شہید قبر میں صلیب ظلم گاڑ دی گئی
لحد اجاڑ دی گئی
جو خیر کا نشان تھی
سلام حجر بن عدیؓ
حضور حق میں جس کی ہر دعا قبول ہوتی تھی
نفس نفس جہاں اطاعت رسول ہوتی تھی
محاذ حق پہ جس کا ہر قدم قلندرانہ تھا
سرشت قنبرانہ تھی، مزاج ابوذرانہ تھا
پھر ایک بار علیؓ کے عشق کی جزا ملی اسے
شہید راہ حق تھا، دائمی بقا ملی
ورق ورق کتاب حجر خیر پڑھ رہے ہیں لوگ
دمشق! دیکھ پھر علیؓ کی سمت بڑھ رہے ہیں لوگ!"(16)

جنرل محمد ایوب خاں کی جگہ جنرل یحییٰ خاں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور دنیا نے دیکھا کہ جمہوری تحریکوں کے نتیجے میں جنرل محمد ایوب خاں نے حکومت قومی اسمبلی کےسپیکر کے حوالے کرنے کے بجائے کمانڈر انچیف کے سپرد کر دی۔ یہ موقع تھا جب ساری جمہوری قوتیں ایک بار پھر پسپائی اختیار کر چکی تھیں، جیسے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا گیا تھا۔ اس صورت حال میں افتخار عارف کے ہاں ایک نظم وجود میں آئی۔اس نظم میں لاہور میں ہونے والے بسنت کے تہوار کے پس منظر میں جذبات نے لفظوں کا روپ دھار لیاتھا، جو دیکھتے دیکھتے پاکستان بھر کے صاحبانِ دل و نظر کی توجہ کا مرکز بنی، نظم ملاحظہ کیجیے:

"قصہ ایک بسنت کا
پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم، کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا
اور کس کی ڈور ہلکی تھی
انہیں اس سے غرض کیا،پیچ پڑتے وقت کن ہاتھوں میں لرزہ آگیا تھا
اور کس کی کھینچ اچھی تھی؟
ہوا کس کی طرف تھی، کون سی پالی کی بیری تھی؟
پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم۔۔۔
انہیں تو بس بسنت آتے ہی اپنی اپنی ڈانگیں لے کے میدانوں میں آنا ہے
گلی کوچوں میں کانٹی مارنا ہے اور پتنگیں لوٹنا ہے، لوٹ کے جوہر دکھانا ہے
پتنگیں لوٹنے والوں کو کیا معلوم کس کے ہاتھ کا مانجھا کھرا تھا

اور کس کی ڈور ہلکی تھی؟"(17)

افتخار عارف کی دو اور نظمیں "احتجاج" اور " ایک نابینا بستی کے نام" بھی اس صورت حال کو آئینہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس تقسیم در تقسیم کے عمل نے شعرا کو بھی ایک اذیت میں مبتلا کر دیا۔ ایک قومیت کا تصور بھی پل بھر میں زمیں بوس ہو گیا۔ ملک پر حبس وجبر کی فضا قائم ہو گئی۔ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والی فوجی حکومت نے عوام کی زبان پر چپ کی مہر لگا دی۔ اس ماحول نے منافقت، مکر و فریب اور چاپلوسی کی راہیں ہموار کیں اور ملکی صورت حال 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کے مصداق ہو گئی عوام مجبور محض اور مہر بہ لب ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں افتخار عارف کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

افتخار عارف خاموش تماشائی نہ بنے بلکہ انہوں نے مسلسل اپنی آواز بلند کیے رکھی۔ انہوں نے نہایت جرات اور بے باکی سے جبر، ظلم اور ہر قسم کی نفرت کے خلاف مزاحمت کا علم بلند کیا۔ اس لیے کہ انہیں اہل قلم ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا احساس تھاکیونکہ اللہ تعالی نے علما و فقرا پر ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ ظالموں کو ظلم کرنے سے منع کریں اور مزاحمت اختیار کریں۔

افتخار عارف نے اہل قلم ہونے کے ناتے اپنے فرض اور اللہ کے حکم کویاد رکھا۔ ان کی شاعری میں مزاحمت و مدافعت کی کئی سطحیں ملتی ہیں۔ وہ سیاسی، سماجی اور مذہبی جبر کے خلاف مزاحمتی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ سیاسی جبر کے نتیجے میں عوام کے رویے ان کی شاعری کا موضوع بنتے ہیں اور مذہبی جبر کے نتیجے میں حضرت امام حسین اور واقعہ کربلا کا بیان افتخار عارف کی شاعری میں پرتاثیر اندازمیں ملتا ہے۔

افتخار عارف سیاسی حالات کے نتیجے میں عوام کی حالت زار کے نمائندہ شاعر ہیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ قیام پاکستان سے اب تک زیادہ تر سیاستدانوں کا مطمع نظر کبھی پاکستان کی خوشحالی نہیں رہا۔ سیاستدانوں کو موضوع بناتے ہیں تو سیاست میں آگے بڑھنے اور جمے رہنے کے لیے داؤ پیچ لڑانے کے معرکے ان کی فکر کا حصہ بنتے ہیں۔ وہ اقتدار حاصل کرنے کو ایک کھیل سمجھتے ہیں، جس میں فاتح سیاسی ٹیم بہت سے بے بس اور کمزور لوگوں کا سر کچل کر جیت اور فتح کا جشن مناتی ہے۔ افتخار عارف نے اقتدار کی رسہ کشی کے مناظر کی بھر پور عکاسی کی ہے۔اس نظم کو پاکستان کے سیاسی منظر نامے کے حوالے سے بے پناہ شہرت ملی، ہر طبقے میں مقبول ہوئی۔ منّو بھائی سمیت اہل علم و دانش کی بڑی تعداد نے اس کی مسلسل تعریف و توصیف کی۔

پاکستان کی سیاست میں بلوچستان کی تاریخ سیاسی نشیب و فراز سے بھری پڑی ہے اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مسلح اقدامات کی بھی ایک طویل تاریخ ہمارا منہ چڑاتی رہتی ہے۔ وفاقی حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں سرکشی کو فرو کرنے کے لیے فوجی اقدام کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدام جمہوریت کی قدروں کےسراسر منافی تھا۔ اس پس منظر میں افتخار عارف نے ایک نظم ملاحظہ کیجیے:

"اور ہوا چپ رہی"

شاخ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کے تگ و تاز پر بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اڑاتا ہوا لشکر بے اماں گل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزو مند آنکھیں، بشارت طلب دل، دعاؤں کو اٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور تب حبس کے قہر ماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے
اور منادی کر ادی گئی
جب کبھی رنگ کی، خوشبوؤں کی،اڑانوں کی،آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے

گی
یہ عذاب ان زمینوں پہ آتے رہیں گے"(18)

بلوچستان کےنامور اہل دانش ڈاکٹر شاہ محمد مری کی ادارت میں ماہنامہ سنگت شائع ہوتا ہے۔ اس میں مکمل تفصیل کے ساتھ پس منظر بیان ہوا ہے،جس کے تحت نظم تخلیق ہوئی۔ بتایا گیا کہ عطا شاد نے ایک نظم لکھی۔ ملک کے اہل قلم سے انہوں نے شکوہ کیا کہ جب ہمارے کوہ کنوں پر یورش و یلغار کا زمانہ تھا توکسی نے نہ ہمارے بارے میں جاننے کی کوشش کی، نہ احوال پوچھا۔ افتخار عارف نے اپنے دوست عطا شاد سے درد مندی کے اظہار میں یہ نظم کوئٹہ، بلوچستان میں اپنےقیام کے دوران میں لکھی۔

افتخار عارف بی سی سی آئی لندن میں کام کر رہے تھے،جب بھٹو صاحب کو راولپنڈی میں پھانسی دی گئی۔ اس زمانے میں ان کی دو نظمیں پاکستان میں بہت پڑھی جا تی رہیں۔ کم و بیش یہی وہ زمانہ ہے جب حبیب جالب کی بہت طاقتور نظم "ظلمت کو ضیا کیا لکھنا" اور احمد فراز کی معرکہ آرا نظم "محاصرہ"، شہر بہ شہر سوغات کے طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ افتخار عارف ایک عرصے تک اکادمی ادبیات پاکستان کے ساتھ چیئرمین اور ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ اسی اکادمی کی پہلی پہلی اہل قلم کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے جن شاعروں اور ادیبوں کے خلاف تقریر کی، ان میں اختر حسین جعفری، احمد جاوید اور افتخار عارف شامل تھے۔تقریر میں سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"اس کے ساتھ ساتھ ایک ستم ظریفی یہ ہے کہ اخباری کالموں یا ادبی تحریروں کے ذریعے جو خواتین و حضرات حکومت کے جبر و استبداد کا چسکے لے لے کر ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ وطنِ عزیز میں "حبس کا وہ موسم ہے جو گزرتا ہی نہیں" "کوئی پرندہ کسی نئے موسم کا سندیسہ نہیں لاتا" "کسی ابجد سے زندانِ ستم کے در نہیں کھُلتے" وغیرہ وہ سب کے سب یا تو سرکاری ملازم ہیں یا سرکار دربار سے مراعات کے متلاشی رہتے ہیں۔ میں ان کے نام گنوا کر اس محفل کی فضا بوجھل کرنانہیں چاہتا۔ جس طرح ان کی بات سمجھ رہا ہوں امید ہے وہ بھی میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ انہی میں سے بعض ایسے ہیں جو اپنے پوتڑے دوسروں کی گلیوں میں دھونے کو عظیم جہاد قرار دیتے ہیں اور دیارِ غیر میں بیٹھ کر کبھی "محاصرے" کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی "شہادت کی خوشبو" پھیلاتے ہیں" اور کبھی ولایت کے ائیر کنڈیشنڈ ہال میں بیٹھ کر نعرہ زن ہوتے ہیں:

سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے، بہت پرانا قصہ ہے"(19)

یہ امر بہت دلچسپ ہے کہ جنرل محمد ضیاء الحق نے اردو کے ایک افسانہ نگار اور شاعروں کو موضوع بحث بناتے ہوئے ان کی مزاحمتی تحریروں کی مذمت کی اور افتخار عارف کی نظم کے دو مصرعے خاص طور پر اقتباس کر کے طنز کے نشتر برسائے۔ دراصل ہر آمر طاقت کے نشے میں چور ہوتا ہے اور وہ تخلیق کی طاقت اور قوت کو جھٹلاتا چلا جاتا ہے مگر یہ بات اس کےلیے قبول اور تسلیم کرنا شاید ممکن نہیں ہوتا کہ وقت اپنی گواہی خود منتخب کرتا ہے، جو ہمیشہ سچی ہوتی ہے۔آئیے افتخار عارف کی مکمل نظم ملاحظہ کیجیے:

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے
یہ سناٹا طبل و عَلم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے

یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں(20)

ہجرت کی سیاست کے پس منظر میں بہت سے شعر لکھے گئے۔اور غزل اور نظم کا ذکر کبھی بلند آہنگی کے ساتھ اور کبھی چھپا کر کیا جاتا رہا مگر جو بات سیدھے سبھاؤ، صاف اور واضح انداز میں افتخار عارف نے کہی، اسے سچائی کے سبب بے پناہ مقبولیت ملی۔ نظم میں تو ہجرت کے بارے میں متعدد قرینے برتے گئے مگر افتخار ارف کی غزل میں وقتا فوقتا اس کی ترجمانی کی گئی،اشعار ملاحظہ کیجیے:

"مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے"(21)

"پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے جو اپنے گھر رہتے"(22)

"تمام خانہ بدوشوں میں مشترکہ ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کے دیکھتے ہیں"(23)

"شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا"(24)

جلا وطنی سے واپسی کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو نے جب پہلی بارحکومت سنبھالی تو یہ کہا جانے لگا کہ انہیں فوجی حلقوں کی حمایت حاصل تھی۔ اس سے قطع نظر کہ یہ بات درست تھی یا غلط، مگرافتخار عارف کے ہاں اس پر رد عمل نظم "خوں بہا" کی شکل میں آیا، ملاحظہ کیجیے:

"اپنے شہسواروں کو
قتل کرنے والوں سے
خوں بہا طلب کرنا
وارثوں پہ واجب تھا
قاتلوں پہ واجب تھا
خوں بہا ادا کرنا
واجبات کی تکمیل
منصفوں پہ واجب تھی
(منفصوں کی نگرانی
قدسیوں پہ واجب تھی)
وقت کی عدالت میں
ایک سمت مسند تھی
ایک سمت خنجر تھا
تاج زر نگار اک سمت
ایک سمت لشکر تھا
اک طرف مقدر تھا
طائفے پکار اٹھے
"تاج و تخت زندہ باد!
ساز ورخت زندہ باد!"
خلق ہم سے کہتی ہے، سارا ماجرا لکھیں
کس نے کس طرح پایا اپنا خوں بہا، لکھیں

چشم نم سے شرمندہ،
ہم قلم سے شرمندہ سوچتے ہیں کیا لکھیں!"(25)

سوویت یونین کے زوال کے ساتھ ہی دنیا کے نقشے پر تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ مشرقی بلاک ٹوٹنے لگا، دیوار برلن جو فتح مندی کی نشانی تھی، گرا دی گئی۔ ایک طرف جشن کا عالم تھا اور دوسری طرف ایک گروہ تھا جو اس پر نوحہ کناں تھا۔ ماسکو میں لینن کا مجسمہ گرایا گیا۔ فہمیدہ ریاض نے نظم لکھی"برلن کی دیوار گرائی گئی"افتخار عارف نے اس واقعے پر"شکست" کے عنوان سے یہ شعر تخلیق کیے،ملاحظہ کیجیے:

"زمین سنگ سے سورج اگانے والے ہاتھ
کسے خبر تھی کہ اس شہر میں قلم ہوں گے
جہاں سے پرچم دست ہنر بلند ہوا
زمین عقیدہ فردا سے لالہ رنگ ہوئی
افق ستارہ محنت سے ارجمند ہوا
اور اب کے بار قلم بھی انھی کے ساتھ رہے
جو اپنی فتح کے نشے میں چور نخوت سے
دریدہ دامنی اہل دل پہ ہنستے ہیں
فغان قافلہ مضمحل پہ ہنستے ہیں"(26)

یہ بات کہنے کی نہیں رہی کہ افتخار عارف کے بے شمار شعر ضرب المثل بن چکے ہیں، خاص طور پر مزاحمتی مزاج کے شعروں اور مصرعوں کی شہرت کسی بھی دوسرے شاعر سے زیادہ رہی ہے۔ اس کی گواہی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دے گا مگر افتخار عارف کا شعر اپنے فنی اور جمالیاتی معیار کی اعلیٰ کلاسیکی سطح سے نیچے نہیں آتا۔ ملاحظہ کیجیے کہ آمرانہ مزاج رکھنے والے حکمرانوں کے رویوں پر کیسا لطیف مگر واضح طنز اور تبرہ کیا ہے:

"یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں"(27)

ہر جابر کے یک بینی و دوگوش ہٹائے جانے پر پیدا ہونے والی صورت حال پر اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے۔ طاقت کا خاصا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرتی ہے مگر اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ طاقت کھو جانے کا خوف کھائے چلا جاتا ہے۔ تمام نخوتوں اور جاہ و جلال کے ساتھ زمیں بوس ہوتا ہے تو کوئی اس پر تھوکنے کو بھی تیار نہیں ہوتا، افتخار عارف کا شعر ملاحظہ کیجیے:

"خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے ہیں
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں"(28)

پچھلے دس برسوں میں شاید ہی کوئی غزل یا اشعار اتنے نقل کیے گئے ہوں گے جتنے درج ذیل شعر باقاعدہ محافل، ٹی وی، اخبارات میں مسلسل شائع اور نشر ہوتے رہے ہیں۔ تماشا غزل کا ہر جگہ تقاضا کیا جاتا رہتا ہے۔ شعر پڑھتے جائیے اور ایک فلم آپ کے سامنے گزرتی چلی جائے گی۔ چہرے، کہانی، حالات، شعر کے آخر آخر تک دستاویز بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ غزل افتخار عارف کی نمائندہ غزل تو ہے ہی، اکیسویں صدی کی شاعری میں غزلوں کا کوئی بھی نمائندہ انتخاب کیا گیا تو یہ غزل ضرور شامل ہو گی۔ افتخار عارف کی شاہکار اور زندہ جاوید غزل ملاحظہ کیجیے:

کب تماشا ختم ہو گا

بکھر جائیں گے ہم کیا جب تماشا ختم ہو گا
مرے معبود! آخر کب تماشا ختم ہو گا
چراغ حجرہ درویش کی بجھتی ہوئی لو
ہوا سے کہہ گئی ہے اب تماشا ختم ہو گا
کہانی میں نئے کردار شامل ہو گئے ہیں
نہیں معلوم اب کس ڈھب تماشا ختم ہو گا

کہانی آپ الجھی ہے کہ الجھائی گئی ہے
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشا ختم ہو گا
زمیں جب عدل سے بھر جائے گی نورعلی نور
بنام مسلک و مذہب تماشا ختم ہو گا
یہ سب کٹھ پتلیاں رقصاں رہیں گی رات کی رات
سحر سے پہلے پہلے سب تماشا ختم ہو گا
تماشا کرنے والوں کو خبر دی جا چکی ہے
کہ پردہ کب گرے گا کب تماشا ختم ہو گا
دل نا مطمئن ایسا بھی کیا مایوس رہنا
جو خلق اٹھّی تو سب کرتب تماشا ختم ہو گا"(29)

جس دن ذوالفقار علی بھٹو کو دار پر کھینچا گیا، اس کے دوسرے دن ایک اخبار نے کسی "معتبر" بیان کے حوالے سے سرخی لگائی، ہر طرف سکون ہے۔ اور اسی شام بی بی سی ریڈیو سے افتخار عارف نے "آخری آدمی کا رجز" کے عنوان سےیہ نظم پڑھی:

"مصاحبین شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سربریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
فغان خلق اہل طائفہ کی نذر ہو گئی
متاع صبر و حشت دعا کی نذر ہو گئی
امید اجر بے یقینی جزا کی نذر ہو گئی
نہ اعتبار حرف ہے نہ آبروئے خون ہے
سکون ہی سکون ہے
مصاحبین شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سربریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے
خلیج اقتدار سرکشوں سے پاٹ دی گئی
جو ہاتھ آئی دولت غنیم بانٹ دی گئی
طناب خیمہ لسان و لفظ کاٹ دی گئی
فضا وہ ہے کہ آرزوئے خیر تک جنون ہے
سکون ہی سکون ہے
مصاحبین شاہ مطمئن ہوئے کہ سرفراز سربریدہ بازوؤں سمیت
شہر کی فصیل پر لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے
سکون ہی سکون ہے"(30)

ہمارے ہاں پاکستان کے سیاسی منظر نامے کی اہم سیاسی شخصیات اور شعلہ بیاں مقررین اس زمانے میں منعقد ہونے والے جلسوں میں مسلسل یہ نظم پڑھتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حمد، نعت، سلام، منقبت ہو، غزل ہو یا نظم، افتخار عارف جمال، حق، خیر، بھلائی، انسانی عظمت و وقار، اقدار، آزادی، بنیادی حقوق، اخلاقی ارتفاع اور مظلوموں کے حق میں کبھی مدہم کبھی تیز، کبھی اقرار، کبھی انکار کے راستے مسلسل آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مذکورہ بالا تمام وسیلوں سے ظلم و تعدی، جبرواستحصال کے ہر ہتھکنڈے اور رویّے کے خلاف اعلائے کلمتہ الحق کا فرض ادا کیا ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ اہل قرطاس و قلم اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں، چند مسلسل اقتباس ملاحظہ کیجیے:

مشتاق احمد یوسفی

"ان کا مزاج کلاسیکی اور ڈکشن جدید ہے۔ المیہ کربلا اور اس سے متعلق امیجری کو انہوں نے بڑی پرکاری، توانائی اور تازگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مزاجا وہ ایک مذہبی آدمی ہیں۔ یہی روایت اور اس سے وابستہ تلمیحات اور تمثیل کاری ان کے شعر کی زرتار بنت میں بار

بار ابھرتی ہیں۔"(31)
این میری شمل
"افتخار عارف کے ہاں قاری کو ایک جدید پاکستانی کے احساسات کی نمائندگی انتہائی بھر پور طریقے سے ملتی ہے۔ ہمارے وقت میں ہونے والے انسانیّت سوز مظالم اور خود انسانیّت کی زبوں حالی کا بیان افتخار عارف اس قدر شدید انداز میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بین السطور واقعہ کربلا کی جھلک دیکھ رہا ہوتا ہے کیونکہ تاریخ کے اس انتہائی دلدوز واقعے کی جھلک آپ کو برصغیر کی شاعری میں کسی نہ کسی طور ضرور ملے گی خواہ وہ کلاسیکی اور غیر کلاسیکی اردو شاعری ہو یا پنجابی، سندھی یا علاقائی شاعری۔"(32)
میرزا ادیب
"افتخار عارف کی تخلیقی شخصیت کی تعمیر میں ان تین اجزاء کی خصوصی اہمیت ہے۔
پہلا جزو ہے صبر۔۔ وہ طبعا صابر ہیں۔
دوسرا درد مندی۔۔ درد مندی کی دولت کو وہ دنیاوی مال و منال پر ترجیح دیتے ہیں۔
اور تیسرا حرمت حرف۔۔ لہجے کے جلال سے مراد تخلیقی قوت کی وسعت طلبی اور ہمہ گیری ہے۔"(33)
اوپندرناتھ اشک
"افتخار مجھے اس لیے بھی اچھا لگتا ہے کہ تمام احتجاج اور اجتہاد کے باوجود ایک نظر انسان کے ناتے، اپنے اعمال و افعال پر بھی رکھتا ہے اور ان کی تصویر کشی کرنے سے گریز نہیں کرتا۔"(34)
فرمان فتح پوری
"افتخار عارف کی شا عری میں زندگی اور اس کے روشن مستقبل کے بارے میں، اعتماد اور ایقان کی ایک ایسی فضا بھی ملتی ہے جو زندگی سے دست وگریباں رہ کر اسے تابناک بنانے کی جرات و آرزو بھی رکھتی ہے۔"(35)
انتظار حسین
"افتخار عارف نے ہماری تاریخ کے ایسے واقعے کو آج کے تجربے کو سمجھنے کے لیے اسے مشعل راہ بنایا ہے جس سے ایک طرف مسلمانوں کے اگلے پچھلے اعمال و افعال کو سمجھنے پرکھنے کے لیے بہت سے باب کھلتے ہیں، دوسری طرف وہ ملک و ملت سے بلند ایک ابدی انسانی رزمیے کے استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔"(36)
ڈاکٹر آفتاب احمد
"کربلا کاالمیہ تو اسلامی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے اور اس میں رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے خاندان کے محترم افراد شامل تھے لیکن افتخار عارف نے تو اسلامی تاریخ کے ایسے کرداروں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے جو اپنے نام و نسب کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنےتقوے اور قوّت ایمانی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ "حرف باریاب" میں افتخار عارف نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ پر بھی نظم لکھی ہے اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ پر بھی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک معمولی انسان تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ان کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ نے اس وقت کے صاحب اقتدار طبقے کے خلاف، غربا اور مساکین کے حقوق کی حمایت کی اور اس لحاظ سے وہ اسلامی تاریخ میں آج کل کی اصطلاح میں بائیں بازو کے ایک علمبردار کی حیثیت سے یاد کیے جا سکتے ہیں۔"(37)
گوپی چند نارنگ
"انہوں نے اپنی کئی نظموں میں بھی یہی سوال اٹھایا ہے اور جاہ پرستی، رزق کی مصلحت اور زر طلبی پر چوٹ کرتے ہوئے آج کے انسان کو خبردار کیا ہے کہ وہ فن آسانی کا شکار ہو گیا ہے اور بزرگوں کا لہو اسے آواز نہیں دیتا۔ "آخری آدمی کا رجز"| میں فغان خلق اہل طائفہ کی نذر ہو چکی ہے اور چاروں طرف سکون ہی سکون ہے۔"(38)
ابرار احمد
"افتخار عارف کو وطن کی فضا میں سکون ہی سکون دکھائی دیتا ہے۔ موت جیسا سکون۔ زندگی کی حرارت سے خالی سکون۔ ایسا سکون جو کسی بہت بڑے طوفان کی آمد سے پہلے کا سکون

ہے۔ افتخار عارف نے متعدد غزلوں اور نظموں کے ذریعے اس جابرانہ عہد کے خلاف احتجاج کو زبان دی ہے۔"(40)

مزاحتمی ادب کے باب میں ہماری تاریخ بے حد ثروت مند ہے۔ کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں کہ جب اہل قلم نے ارباب بست و کشاد کے ظلم و ستم، جبر و تشدد، وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ، سازشوں اور ستم ظریفیوں کے پردے چاک نہ کیے ہوں۔ اردو شاعری میں پاکستانی عہد کا اثاثہ ایسا توانا اور بھر پور ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری کے سامنے ماند نہیں پڑتا۔ اس نسبت سے افتخار عارف کا سارا شعری سفر قوم کے خوابوں کو پامال کرنے والوں، جبر و استحصال کے پہاڑ توڑنے والوں اور لوٹ کھسوٹ کے بازار گرم کر کے قوم کے سفر کو کھوٹا کرنے والوں کے خلاف کٹھن مسافت جیسا لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر میں اردو شاعری کے میدان میں افتخار عارف کا کوئی ثانی نہیں۔

حوالہ جات

1. فیض احمد فیض، میزان،کراچی، اردو اکیڈمی سندھ،1987ء،ص 15 تا 17
2. رشید امجد,ڈاکٹر(مرتب)، مزاحمتی ادب،اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 1995ء، ص 19
3. شیما مجید، (مرتب)، جواز افتخار، راولپنڈی، نواب سنز پبلی کیشنز- 2005ء، ص 24 تا 27
4. علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال اردو، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1986ءص355
5. علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، 1985ء، ص1028
6. علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی، ص153
7. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 136
8. افتخار عارف، کتاب دل و دنیا،کراچی، مکتبہ دانیال،2009ء،ص 143
9. افتخار عارف، کتاب دل و دنیا،ص 140
10. افتخار عارف، کتاب دل و دنیا،ص ص 114،113
11. افتخار عارف، کتاب دل و دنیا،ص 114
12. افتخار عارف، کتاب دل و دنیا،ص 132
13. افتخار عارف، کتاب دل و دنیا،ص 134
14. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 129
15. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا،ص ص 130-131
16. افتخار عارف، شہر علم کے دروازے پر، جہلم، بک کارنر،2019ء، ص 176،166
17. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 459
18. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 508
19. اکادمی ادبیات پاکستان (مرتب)، مقالات، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، 1979ء، ص 19
20. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص560
21. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص185
22. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص309
23. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص293
24. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 183
25. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 522-523
26. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 529
27. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص231
28. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 196
29. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 251-250
30. افتخار عارف، کتاب دل ودنیا، ص 458-457
31. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 63
32. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص66
33. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 75
34. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 88
35. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 118
36. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 126
37. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 128
38. شیما مجید(مرتب)، جواز افتخار، ص 141
39. رشید امجد،ڈاکٹر(مرتب)، مزاحمتی ادب، ص 19
40. ڈاکٹر رشید امجد(مرتب)، مزاحمتی ادب، ص68